© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

اشارات

مغربی فلسفہ وتمدن کا پودا جب تک پھولنے کے دَور میں تھا تو اس کی رنگا رنگ کلیوں کو چٹکتے دیکھ کر دنیا کی دنیا حیرت زدہ تھی، مگر اب اس کے پھلنے کا دور آگیا ہے اور کڑوے کسیلے پھل یکے بعد دیگرے گر گر کر انسانیت کی جھولی میں گر رہے ہیں۔ یہ پھل چکھنے کے بعد اب خود اس فلسفہ وتمدن کے باغبان سوچ میں پڑ گئے ہیں کہ کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہوگئی ہے اور اس کے ازالے کی فکر شروع ہوگئی ہے!

اس فلسفہ وتمدن کے سائے میں زندگی کا ارتقاء بالکل یک رُخا ہوا ہے یعنی جہاں تک مادہ پرستانہ تعقل، ایجادات واکتشافات، اسباب وذرائع اور تسکین خواہشات کے لوازم کا تعلق ہے آدمی گذشتہ پانچ صدیوں میں اتنی تیز رفتاری سے آگے بڑھا ہے کہ اس رفتار کی کوئی مثال اس کی ہزاروں برس کی تاریخ میں نہیں ملتی، لیکن دوسری طرف مادی ترقی کے متوازی جو اخلاقی ترقی ہونی چاہیے تھی وہ برابر برابر کی رفتار سے تو کجا، اتنی معمولی رفتار سے بھی جاری نہیں رہ سکی جتنی موجودہ روشن دَور سے قبل کے تاریخی اَدوار میں برقرار رہی ہے۔ انسان فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرنے میں آگے بڑھ گیا ہے مگر وہ خود اپنے آپ کو مسخر نہیں کر سکا۔ آج زندگی کی گاڑی مادیت کے اسٹیم کے زور سے انتہائی تیز رفتار کے ساتھ زوال کے ایک نشیب سے لڑھک رہی ہے مگر مصیبت یہ کہ وہ اخلاقیت کے بریکوں سے بالکل آزاد ہے۔ سامنے تباہی کے بھیانک غار منہ کھولے دکھائی دینے لگے ہیں۔ ڈرائیور بے بس ہیں، مسافر اس صورتِ حالات سے بے خبر تیز رفتاری کے نشے میں سرمست گاڑی کے اندر کہیں آپس میں لڑ مر رہے ہیں اور کہیں عیش وتفریح میں گم ہیں۔ البتہ اونچے درجے کے مفکرین خطرے کو بھانپ گئے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح مادی تمدن کی گاڑی کو بریکوں سے آراستہ کر دیں۔ حالانکہ وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے

تاہم ان مفکرین نے اپنے تمدن کا ناقدانہ مطالعہ کر کے اس کی کمزوریوں کو جس طرح نگاہوں کے سامنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لارکھا ہے اور زوال کے خطرے کو محسوس کر کے انسانیت کو جو وارننگ دی ہے، اسے مغرب کے تازہ لٹریچر میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان لوگوں نے عمروں کے مطالعہ و فکر کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے مسلسل ایسی کتابیں چلی آ رہی ہیں جو مغربی تمدن کو تباہی سے بچانے کے لیے اس کے کار پردازوں کو تنبیہ کرتی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اہلِ پاکستان، خصوصاً جدید طبقے کے وہ لوگ جو آج بھی اس تمدن کے سحر زدہ ہیں، ان چیزوں سے واقف ہوں۔

پروفیسر آرنلڈ جے، ٹائن بی تاریخ انسانی کا ایک عظیم المرتبت عالم ہے اور دنیا کے ۲۱ نظام ہائے تمدن کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے "مطالعۂ تاریخ" (A Study of History) کے نام سے ایک جامع تصنیف ۶ مجلدات میں پیش کی ہے۔ اس کے مقدمے میں وہ تاریخ کی طرف سے انسان کو جو وارننگ دیتا ہے اس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:-

"جدید انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا سا ہے جس نے اپنا داؤں بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ اس کا بنک اکاؤنٹ، اس کی معاش اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھے ہیں۔ یہ عمل بڑا خطرناک ہو رہا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اسے بازی مار لینی چاہیے، لیکن اسے اپنے پتوں اور اپنے ہنر پر بھروسہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے بل پر اس کی کامیابی یقینی ہو۔

وہ علمائے اجتماعیات اور معالجینِ نفسیات سے پوچھتا ہے "کب تک تم ایک صالح معاشرہ ہمیں بہم پہنچا سکو گے؟ کیا ہمیں تباہی سے بچانے کے لیے اس کا انتظام بروقت ہو جائے گا؟" پھر جب وہ اسے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتے تو وہ مجھ ایسے تاریخ دانوں سے سوال کرتا ہے "جس نوعیت کی الجھن میں انسانیت آج آ پھنسی ہے اس کے پیشِ نظر آخر تاریخ کا انجام کیا ہوگا؟" ——— "کیا واقعی انسانیت کبھی پہلے بھی ایسی الجھن میں پھنسی ہے جس میں آج ہم مبتلا ہیں؟" ہاں! بارہا! جدید علم حرکیاتِ توالد کی وجہ سے اگر ہم غلط فہمی میں نہ پڑیں تو واقعہ یہی ہے کہ انسان نے پچھلی صدیوں میں بھی اسی طرح تاش کے پتے ہاتھ میں لے کر قمار بازی کی ہے، جو ہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، لیکن گذشتہ زمانوں میں داؤں اس قدر بھاری نہ تھے۔

نقشۂ احوال کو بدلنے کے لیے ابنائے آدم نے پہلے بھی اسی سڑک پر جادہ پیمائی کی ہے جس پر آج ہم کر رہے ہیں۔ اُن کو منضبط رکھنے کے لیے ٹریفک کے قواعد بھی وہی تھے جو آج ہمارے لیے ہیں۔ فرق یہ پڑا ہے کہ پرانے زمانے میں لوگ بیل گاڑیوں پر سفر کرتے تھے یا پیدل اور وہ اپنی سرگشت میں اگر بائیں جانب کی پابندی چھوڑ دیتے تھے تو تصادم تو ہو جاتے تھے مگر مہلک نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اگر ہم آج اسی سڑک پر موٹر گاڑیوں کے جدید ماڈلوں کے ذریعے ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتے ہوئے قواعد کو توڑیں تو ہم ایک عظیم حادثہ برپا کر دیں گے۔ نہ ٹریفک کے قواعد بدلے ہیں، نہ شاہراہ حیات — چاہے انسان اپنی خود فریبی کے لیے یہ سمجھتا رہے کہ صنعتی دنیا کے کل پرزے پیش رفتگاں کے مقابلے میں اس کی برتری کا ثبوت ہیں۔

فنی کمالات بجائے خود حکمتِ بقا کے لیے کوئی ضمانت نہیں ہیں۔ تمدن جب کبھی خود اپنی مکینکل مہارتوں کے دلدادہ ہو کر رہ گئے ہیں تو اس وقت انہوں نے ایک قدم خودکشی کی طرف بڑھا دیا ہے۔ بعید نہیں کہ تمدن اس قسم کے رجحان کا رخ بدل دیں اور از سر نو پنپ سکیں۔ لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ وہ "آلات" پر نگاہوں کو سکیڑ کر مرتکز کرنے کا سدِ باب کر سکیں۔

اکیس تمدنوں کے مطالعہ کے بعد میرا دل اس حقیقت پر ٹھٹک گیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت مند رہتے ہیں جب تک ان میں تخلیق کی صلاحیت برسرِ عمل رہتی ہے اور وہ اپنے جغرافی ماحول، نقلِ مکانی یا داخلی تغیرات کے پیدا کردہ ہر چیلنج کا خیر مقدم جدید اور تخلیقی طریقوں سے کرتے چلے جاتے ہیں۔

آج ہم اپنی مشینی قدرت و فضیلت کی وجہ سے سخت خطرے میں پڑ گئے ہیں۔ اپنی ترقی حرفیات سے ہم اس قدر مسحور ہیں کہ شاید ہم ان وسیع تر تخلیقی اقدامات کو عمل میں لانے سے قاصر رہ جائیں جو ہمیں دیر تک باقی رکھنے کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ ہمارے دور کے خطرناک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی قوم، اپنے جھنڈے اور اپنی تاریخ ماضی کو پوجنے کی تربیت دی گئی ہے۔ آدمی کا صرف ایک خدا کی پرستش کرنا ہی اس کے لیے صحیح ہے، یہ پہلا حکم ربانی درحقیقت افراد اور معاشروں کی نشو و نما کے لیے بھی اولین قانون ہے۔ جب ہم اسے توڑ کر اپنے ماضی کی بت پرستی شروع کر دیتے ہیں تو ہم ناکام و نامراد ہو جاتے ہیں۔

سابق ادوار میں جبکہ ابنائے آدم فی الحقیقت خدا پرستی کے مسلک پر کاربند رہے، وہ ریاست سے محض اتنا تعلق اطاعت رکھتے تھے جتنا آج ہم اپنے شہروں کی کارپوریشنوں سے رکھتے ہیں وہ ان کو ٹیکس دیتے تھے، ان کے انتخاب میں ووٹ دیتے تھے، لیکن وہ ریاست کو اپنے ضمیر میں پر حکمراں ہونے کا حق نہیں دیتے تھے۔ لیکن آج قوم پرستی مذہب کا جدید بدل بن گئی ہے — اور میری رائے میں یہ بہت ہی برا بدل ہے۔ ہٹلر اور مسولینی نے یہ قرار دے کر کہ ریاست اپنے شہریوں سے سو فیصدی اطاعت کا مطالبہ کرتی ہے قوم پرستی کے جدید مسلک کو اس کی امکانی انتہا تک پہنچا دیا۔ آج اس غلطی میں جدید ممالک کے تمام شہری حصہ دار ہیں۔

یہ مجنونانہ "ریاست پرستی" جسے ہم آج ایک مسلمہ کی حیثیت سے اختیار کیے ہوئے ہیں، بت پرستی کی نہایت ہی بری شکل ہے۔ ٹھیک یہی حال ہمارے اس بیں مگر زعم کا ہے کہ سائنس ہماری موجودہ گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے۔

ہماری جدید سائنٹفک ترقیات صنعتی دور کے چیلنج کا ایک تخلیقی جواب تھیں — اور ایک نفیس جواب! لیکن آج جو مسائل ہمیں درپیش ہیں، وہ اس نوعیت کے نہیں ہیں کہ ان کا جواب تجربہ گاہوں سے دیا جائے۔ یہ اخلاقی مسائل ہیں — اور سائنس اخلاق کے دائرے میں کوئی دخل نہیں رکھتی۔

۱۹۴۸ء کا تغیر نہایت واضح ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس طبعی قوت کو کس طرح استعمال کر رہے ہیں جو ہمارے سائنس دانوں نے حاصل کر کے دی ہے؟ اگر اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہم بدستور سابق سائنس کا زیادہ سے زیادہ علم جمع کرتے جائیں تو ہم ایک خوفناک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حادثے کا سامان کریں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن تمدنوں نے اپنی بقا کے لیے جنگی قوت پر انحصار کیا ہے، مٹ گئے ہیں۔ فوجی فتح جو مسائل پیدا کر دیتی ہے انہیں ایک سپاہی کا ہنر حل نہیں کر سکتا۔

زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔ کامیابی کے لیے کوئی ایک گر منضبط نہیں کیا جا سکتا۔ حالات کا ہر نیا چیلنج ایک فرد یا ایک معاشرے سے بالکل ایک نئے اور بے ساختہ جواب کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن آدمی کاہل ہے۔ جب تک پرانے حل کام دیتے رہتے ہیں وہ سوچنے پر تیار نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ سبب جس کے تحت جدید انسان دنیا کے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں اپنے فرسودہ مادہ پرستانہ حل سے امیدیں توڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان تسخیر فطرت میں جتنا ہوشیار نکلا ہے، اتنا ہی اپنی تسخیر کا ہنر سیکھنے میں وہ پسماندہ ہے۔

اگر عالمی وحدت کے مسئلے کا کوئی لگا بندھا حل ممکن ہوتا تو ہم معاوضے دے کر اپنے محققین کو اس کی تحقیق میں لگا دیتے۔ لیکن اگر ـــــ جیسا کہ واقعہ ہے ـــــ یہ مسئلہ جدید انسان کے اندر ایک روحانی تبدیلی کا تقاضا کرتا ہو تو پھر یہ خدمت ہم اپنی سول سروس کلاس سے نہیں لے سکتے۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہ کام خود کرنا ہوگا۔ یہ بڑا پریشان کن اندازہ ہے لیکن یہ بات صرف روحانی احیاء ہی کے ذریعے ممکن ہے کہ ایک تمدن حالات کا مقابلہ کر سکے۔

اگر ہم اس مطلوبہ اخلاقی تحول پر راضی ہوں تو پہلی چیز جو ہمیں سیکھنی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے دور کے محبوب بتوں ـــــ مشینری، قومی جھنڈے، اقتصادیات اور خود سائنس ـــــ کو پوجنا چھوڑ دیں۔ وہ لوگ جو اونچے درجے کی کامیاب اقوام سے تعلق رکھتے ہیں، وہ ایک جہانی ریاست کے حصول کے لیے قوم پرستی کو چھوڑنے میں خاص طور پر دقت محسوس کریں گے لیکن اگر دنیا کی بڑی طاقتیں بدستور وطنیت کے ساتھ نیشنلزم کے پرانے تصور سے چمٹی رہیں، جو آج آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے تو پھر وہ لوگ جن کی نگاہوں میں نیشنلزم ایک کامیاب تجربہ نہیں ہے، آگے آ کر دنیا کے سامنے نیا حل پیش کرنے والے ہوں گے جس کی یہ منتظر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمیں وحدتِ عالم کو حاصل کرنا ہے، مگر یہ عین ممکن ہے کہ جہانِ واحد ـــ جو ہماری اوّلین تمنا ہے ـــ کو تشکیل دیتے ہوئے ہم اپنا ہدفِ مقصود بہت پست مقرر کر بیٹھیں، کیونکہ میرے نزدیک یہ قطعی ہے کہ انسانی برادری کا قیام اس وقت تک بالکل غیر ممکن ہے جب تک کہ ابنائے آدم ایک قادرِ مطلق پر ایمان لانے کے بندھن سے باہم مربوط نہ ہوں۔

اپنے مسائل کو خالص مادی تدابیر سے حل کرنے کی ہماری حالیہ مساعی بداہتہً ناکام ہو چکی ہیں اور انہوں نے ہمارے بلند بانگ منصوبوں کا خاکہ اڑا دیا ہے۔ مثلاً ہمارا ادعا ہے کہ ہم نے کفایتِ محنت (Labour Saving) کا ذریعہ بننے والی مشینری کی ترقی میں بڑی عظیم الشان چھلانگیں لگائی ہیں ـــ اور یہ واقعہ ہے۔ لیکن اس ترقی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ عورتوں پر کام کا بار آج اتنا زیادہ ہے کہ پہلے اتنا کبھی نہ تھا۔ جدید عورت دوہرا کام کرتی ہے۔ ایک ماں اور بیوی ہونے کی حیثیت سے گھر میں، دوسرا اجیر کی حیثیت سے دفتر یا کارخانے میں! یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ تاریخ انسانی میں زوال کے دور بالعموم وہی تھے جبکہ عورت نے گھر کو خیرباد کہہ دیا ہے۔

پھر مشینی دور کے تحت ضروریات کی فراوانی کے بجائے ہمارے لیے ضروریات کا (مثلاً مکانات کا) توڑا ہو گیا ہے۔ یہ دور ہمارے لیے وہ تحفہ ساتھ لانے کے بجائے جسے "کفایتِ محنت" کے مفہوم کی روشنی میں فراغت کا نام دیا جا سکتا ہے، بے روزگاری اور انسانی محنت کی کمیابی کے متبادل وقفے لے کے آیا ہے۔ ہم نے مشین کو جھنجوڑ دینے والے نتائج پیدا کرنے کے لیے کھلا چھوڑنے کا طریقہ خوب آزمایا ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ انسان کے لیے اخلاقی اقدامات جتنے ضروری گذشتہ سادہ زمانوں میں تھے، آج بھی اُتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ فیصلہ کن حد تک ضروری ہو گئے ہیں۔

تمام عظیم الشان تاریخی فیصلے ہمیشہ اخلاقی فیصلے ہوتے ہیں۔ فنی صلاحیتیں تو خیر اور شر دونوں کے لیے یکساں کارآمد ہیں ـــ کسی نہ کسی کو یہ طے کرنا ہے کہ ہونا کیا چاہیے! آپ اخلاقی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فیصلوں سے کنی کاٹ کر نہیں نکل سکتے۔ یہ ہر مرحلے کے خلتے پر کھڑے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، کیونکہ جو بھی نیا آلہ ہم ایجاد کرتے ہیں وہ ہماری بھلائیوں اور برائیوں کے اثرات کو دور رس تر بنا دیتا ہے، اور سائنس کے میدان میں ہماری ہر پیش قدمی ہماری روحانی قوتوں کی جانچ کے لیے ایک نئی کسوٹی پیدا کر دیتی ہے۔

جن ۲۱ تمدنوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے، ان کو پلٹ کر دیکھتے ہوئے انسان کی قابلیت سے یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ دنیاوی فوائد کو اپنا منتہائے مقصود قرار دینے کے بعد پھر کوئی خوش آئند اخلاقی فیصلے کر سکتا ہے۔ ہاں، نوع انسانی کی محبت ایک تاریخی طاقت ہے، لیکن وہ بھی صرف اسی حالت میں جبکہ وہ فطری نتیجہ ہو خداوند تعالیٰ سے گہری محبت کا! پس دورِ حاضر کی بڑی بھاری ضرورت ایک فوق الطبعی ایمان کا احیا ہے"

اس طویل اقتباس کو بغور ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ کس مہارت سے وقت کا ایک فاضل محقق اپنے اُس تمدن کی کمزوریوں کو نمایاں کر رہا ہے جس کے بنانے والوں اور جس کے چلانے والوں میں سے ایک وہ خود ہے اور جس کے تسلط میں آج ساری دنیا ہے۔ اس نے بیشتر اپنی انگلی ٹھیک ماؤف مقامات پر رکھی ہے۔ اس نے مادّہ کی غلامی، سائنس سے مسحوریت، مشین کے اقتدار، فوجی قوتوں کے غرور، ٹکنیکل مہارت کے فریب اور قوم پرستی کے رجحان پر گرفت کی ہے۔ اس نے عورت کے گھر سے باہر نکل آنے کو تمدن کے لیے ایک خطرے کی علامت قرار دیا ہے، اور وہ اپنے ہم تمدنوں کو متنبہ کر رہا ہے کہ تاریخ کا وہ چیلنج تمہارے سامنے ہے جس کا جواب تم مادیت، سائنس اور صنعتی ترقی کے ذریعے نہیں دے سکتے۔ بلکہ فیصلہ کن اخلاقی اقدامات کی اور روحانی طور پر تجدیدِ حیات کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں آپ کے ہاں کوئی کرے تو آپ عقلیت کے عرشِ اعظم پر بیٹھ کر اسے "ملّا" قرار دے دیں گے اور اس کی کسی بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھیں گے لیکن ٹائن بی ملّا نہیں ہے، عالم ہے اور اتنے اونچے درجے کا عالم ہے کہ آپ تو اگر اس کے علم کی چوٹی دیکھنے کو آنکھیں اٹھائیں تو آپ کے سر کا ہیٹ بہر حال گر پڑے گا۔ ان باتوں کو پڑھیے اور ان سے سبق حاصل کیجیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور مفکر ڈاکٹر الیکسس کارل (Alexis Carrel) ہے جس نے مغربی تمدن کے بارے میں ایک تاحدار کتاب انسان خود ناشناس[1] (Manthe unknown) کے نام سے پیش کرکے بڑا فکر پرور موادِ مطالعہ فراہم کیا ہے۔ اس کے خیالات کی ایک جھلک بھی ملاحظہ فرمالیجیے :-

"ہم اپنے تمدن کی کمزوریوں کو تسلیم کرنے کا آغاز کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ ہوں گے جو چاہتے ہیں کہ جدید معاشرے نے ان پر جو مزعومات مسلط کر دیے ہیں ان کو توڑ ڈالیں۔ یہ کتاب ایسے ہی لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے، ـــــ اور یہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ذہنی، سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کی ضرورت کو محسوس کرتے ہی میں پیش پیش نہیں ہیں بلکہ صنعتی تمدن کو برطرف کرکے انسانی ارتقاء کے لیے نیا تصور ڈھونڈ نکالنا چاہتے ہیں۔

اگرچہ ہم تمام ادوار کے سائنس دانوں، فلسفیوں، شاعروں اور عظیم المرتبت روحانیین کے مشاہدات کے فراہم کردہ وسیع علمی خزانوں کے مالک ہیں، لیکن ہم نے اپنے بارے میں ابھی محض چند پہلوؤں ہی کو جانا ہے۔ ہم نے انسان کو ایک کُل کی حیثیت سے نہیں جانا ہے بلکہ ہم اسے چند باہم گر ممتاز اجزا کا مجموعہ سمجھتے ہیں، اور خود یہ اجزا بھی ہمارے اپنے ہی طریقوں کے پیدا کردہ ہیں۔ اپنے بارے میں ہمارا علم ابھی تک بالکل طفلانہ ہے۔

جدید تمدن نے انسانوں کو ان اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے جو ان پر پیورٹین (Puritan) نظام اور مذہبی اصولوں نے عائد کی تھیں۔"

دیکھیے کارل بھی وہی ٹائن بی والی بات دوہرا تا ہے :-

"مشینی ایجادات میں اضافہ کر دینے سے حالات کو کچھ بھی بہتر نہیں بنایا جا سکتا . . . . اسی طرح اس معاملے میں طبیعیات، فلکیات اور کیمیا کے اکتشافات کو بھی اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ آدمی کو اب توجہ خود اپنے اوپر اور اپنی ذہنی اور اخلاقی نااہلیت پر منعطف کرنی ہے۔

[1] بظاہر کتاب کے نام کا ترجمہ دوسرا ہونا چاہیے تھا، لیکن مصنف کا مدعا پالینے کے بعد ہمیں نام کا اس سے زیادہ بہتر ترجمہ کوئی اور نہیں مل سکا جو ہم نے اختیار کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے تمدن میں لذت، تعیش، جمالیت، وسعت اور پیچیدگیاں بڑھاتے چلے جانے سے کیا حاصل، جبکہ اس تمدن کو اپنے حقیقی مفاد کے رخ لے جانے میں خود ہماری اپنی کمزوریاں مانع ہو رہی ہیں۔ درحقیقت یہ کوئی مفید صورت نہیں ہے کہ ایک ایسے طریقِ زندگی کے بنانے پر دیدہ ریزیاں کی جائیں جو اخلاقی زوال کا، اور عظیم نسلوں کے صالح ترین عناصر کے خاتمے کا موجب ہو رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیز رفتار کے بحری جہاز، زیادہ آرام دہ گاڑیاں، سستے ریڈیو اور بعید تر سحابیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے دوربینیں بناتے چلے جانے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے اوپر زیادہ توجہ صرف کریں۔"

چونکہ یہ شخص ڈاکٹر ہے اس لیے اپنی بحث کا ایک مستقل حصہ وہ اس موضوع پر صرف کر دیتا ہے کہ کثیر پیدا آوری کے جدید مصنوعی ذرائع سے حاصل کردہ غلے اور پھل اور گوشت اور دودھ اپنی غذائی قدر و قیمت کے لحاظ سے دورِ فطرت کی پیداواروں کے مقابلے میں بہت گر چکے ہیں۔ پھر یہ تمدن جو شور ہنگامے، پریشانیاں اور اضطراب ساتھ لے کر آیا ہے، انسان کی صحت کے لیے حد درجہ تباہ کن ثابت ہو رہا ہے۔ بحث کے اس حصے سے ہم صرفِ نظر کرکے آگے چلتے ہیں:۔

"اخلاقی حس کو جدید معاشرے نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم نے اس کے مظاہر کو دانستہ ہر طرف سے دبا دیا ہے۔ غیر ذمہ دارانہ پن سب کی رگوں میں خوب رچ بس گیا ہے۔ وہ لوگ جو بھلے اور برے میں تمیز کرتے ہیں، جو مشقت کرتے ہیں، جو دور اندیش ہیں، وہ بے چارگی میں مبتلا رہتے ہیں اور اس طرح دیکھے جاتے ہیں جیسے وہ حقیر ہوں۔ اگر کوئی عورت جو متعدد بچے رکھتی ہو ذاتی مستقبل بنانے کے بجائے اپنے بچوں پر توجہ صرف کرتی ہے تو پست دماغ شمار ہوتی ہے۔"

وہ اخلاقی حالت کا ایک عمومی نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:۔

"اہلِ فن اور سائنس کے ماہرین جو انسانی آبادی کو جمال، صحت اور دولت سے آراستہ کرتے ہیں افلاس کی حالت میں جیتے ہیں اور مرتے ہیں۔ چور مزے سے ساری ترقیات کے پھل کھاتے ہیں۔ مجرمین کے سرخیل سیاست بازوں کی پناہ میں رہتے ہیں اور جج تک ان کا احترام کرتے ہیں۔ یہ ہیں ہیرو جنہیں بچے سینماؤں میں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنے کھیلوں میں انہی کی نقل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آتارتے ہیں۔ ایک دولت مند کو ہر حق حاصل ہے، وہ اپنی عمر رسیدہ بیوی کو دھتا بتا سکتا ہے، وہ اپنی بوڑھی ماں کو ہے کسی کے گڑھے میں دھکیل سکتا ہے، وہ ان رقوم پر ہاتھ صاف کر سکتا ہے جو اس پر اعتماد کر کے امانتاً لوگوں نے سونپی ہوں ــــ بغیر اس کے کہ اس کے دوستوں کے حلقے میں اس کی قدر و منزلت میں کچھ بھی فرق آجائے۔

ہم جنسی، زنا پورے زوروں پر ہے اور صنفی اخلاقیات بالکل بالائے طاق رکھ دیے گئے ہیں۔ نفسیاتی تجزیہ کار مردوں اور عورتوں کے ازدواجی روابط کے نگراں ہیں۔ غلط اور صحیح، حق اور ناحق کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رہا۔ جرائم پیشہ لوگ عام آبادی کے درمیان آزادی سے پنپ رہے ہیں اور کوئی ان کی موجودگی پر اعتراض اٹھانے والا نہیں ہے"۔

اور سنیے :۔

"بہترین ترقی یافتہ قوموں کے اندر افزائش نسل کی رفتار گر رہی ہے، اور نئی نسل کے حاصل گھٹیا ہیں۔ عورتیں بر رضا و رغبت الکوہل اور تمباکو کے ذریعے اپنے آپ کو گھلا رہی ہیں۔ وہ اپنے بدن کو روایتی نزاکت سے آراستہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو نہایت خطرناک غذائی پابندیوں کے حوالے کرتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ بچے ہونے کے خلاف ہیں۔ یہ مفاسد نتیجہ ہیں اُن کی تعلیم کا، تحریکِ نسواں کی ترقی کا، اور کوتاہ نظر خود غرضی کے بڑھ جانے کا!"

یہ ڈاکٹر مغربی نظامِ تمدن کا اس بے رحمی سے ناقدانہ مطالعہ کرنے کے بعد مفاسد کا حل پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ موجودہ تمدن کی کھینچی ہوئی کسی بھی لکیر کی فقیری کرنا ضروری نہیں ہے۔ بھاری کارخانوں، دفاتر کی سر بفلک عمارتوں، غیر انسانی شہری آبادیوں، صنفی اخلاق اور کثیر پیداآوری تمدن کا کوئی لازمہ نہیں ہیں۔ تہذیب لذت پرستی کے بغیر، جمالِ تعیش کے بغیر، مشینیں غلام ساز کارخانوں کے بغیر، سائنس مادہ کی پرستش کیے بغیر بھی ہو سکتی ہے اور صرف یہی صورت ہے کہ جو انسان کی ذہانت اور اخلاقیت کو بحال کر سکتی ہے لیکن:

"ایسا نقطۂ نظر انسانوں کے درمیان صرف مذہب کی طرف پلٹنے ہی کی صورت میں از سر نو ابھارا جا سکتا ہے ــــ مذہب آدمی کی نگاہوں کو آخرت کی زندگی پر مرتکز کرتا ہے اور اس طریقے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اسے اس کے مادّی ماحول سے بلند تر رکھتا ہے۔

یہ ہے خلاصہ ڈاکٹر کارل کے خیالات کا، اور اس کا پیش کردہ مواد مطالعہ اس قابل ہے کہ اسے بغور پڑھا جائے اور مغربی تمدن کی حقیقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا کر دیکھا جائے کہ اس میں کونسے عناصر ایسے ہیں کہ جن کو محض مرعوبیت کی وجہ سے اپنا لینا مہلک نتائج کا موجب ہو سکتا ہے۔

ان دو بڑے مفکرین کے علاوہ انہی دنوں متعدد دوسرے مغربی اہل قلم نے بھی اپنے تمدن کے متعلق اس سے ملتے جلتے خیالات اور طرز فکر کا اظہار کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ تمدن کے مفاسد کا ازالہ کرنے کے لیے اس کے اصولوں کو مختلف نظاموں یعنی جمہوریت، آمریت اور اشتراکیت وغیرہ کی شکلیں دینے کے جو تجربے ہو رہے تھے ان کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور اب کسی اور تجربے کا منصوبہ باقی نہیں رہا۔ بلکہ اب معاملہ یہاں آ پہنچا ہے کہ تمدن حاضر کی بنیادوں میں جو مفاسد پیوست ہیں ان سے چشم پوشی کرنے کے بجائے ان کا بے لاگ جائزہ لیا جائے اور ان سے اسے پاک کرنے کی فکر کی جائے۔

اس سلسلے میں جہاں تک منفی کام کا تعلق ہے وہ بالکل ٹھیک خطوط پر ہو رہا ہے۔ یعنی دور حاضر کے یہ مفکرین تمدن کی خرابیوں کی جس طرح نشان دہی کر رہے ہیں، خالص اسلامی نقطۂ نظر سے بیشتر قابل داد ہے۔ مادہ پرستی، قوم پرستی، اخلاقی قدروں کا مر جانا، ضمیر کا بے حس ہو جانا، عورتوں کا گھر کی ذمہ داریوں سے گردن چھڑا کے نوکریوں کے پیچھے پڑ جانا، صنفی فساد، افزائش نسل کی رفتار کا گر جانا، یہ سب خرابیاں ایسی ہیں کہ اگر ایک مسلم ناقد بھی تمدن حاضر پر تنقیدی نگاہ ڈالتا تو وہ بھی انگلی انہی پر رکھتا۔

مگر جب یہ لوگ ان سے بچ نکلنے کے لیے مثبت تدبیریں سوچتے ہیں تو ان کی عقل اصولی حیثیت سے تو ان کے مطلوب کی طرف خاص واضح اشارے کر دیتی ہے۔ یہ خوب سمجھ لیتے ہیں کہ انسانوں کو ایک برادری میں ڈھلنے کی ضرورت ہے، ان کو اخلاقی حس کی ضرورت ہے، ان کو اپنے اندر روحانیت کا احیا کرنا ہوگا، ان کو اپنی اخلاقی نشأۃ ثانیہ کا اہتمام کرنا ہوگا، ان کو عورتوں کو زندگی کے ٹھوس ہنگاموں سے الگ رکھ کر گھروں کے نظم و نسق کا ذمہ دار بنانا ہوگا، انہیں معاشرے کو زنا اور اس کے محرکات سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاک کرنا ہوگا، اور بالآخر یہ کہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ مذہب کو از سرِ نو اختیار کیا جائے اور ایک خدا کے سامنے سر جھکایا جائے۔

لیکن عقل کے اشارات کی روشنی میں جب یہ عملی حل کی طرف مارچ کرتے ہیں تو پھر ٹھٹک جاتے ہیں اور ان کا قافلۂ جستجو پھر پھرا کر اسی عیسائیت پر جا رکتا ہے جس کے لیے ان کے اندر ایک متعصبانہ دلچسپی محض اس لیے باقی ہے کہ وہی ایک مذہب ایسا ہے جسے یہ اپنا کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ جس مذہب کی پیاس وہ محسوس کر رہے ہیں وہ انفرادی مذہب نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ایک ایسا دین ہو سکتا ہے جو دورِ حاضر کے حالات کے تقاضوں کے مطابق چلنے والے نظامِ زندگی کے لیے بنیادیں فراہم کر سکے۔ جس خدا پر ایمان لا کر وہ آج کے تمدن کی گتھیاں سلجھا سکتے ہیں وہ خدا عیسائیت کا پیش کردہ خدا نہیں ہے جو عبادت گاہ کے لیے چند ہدایات دینے کے بعد سیاست و معیشت کی پیچیدہ وادیوں میں بالکل گونگا ہو کے رہ جاتا ہے۔

درحقیقت یہ لوگ اپنے تمدن کے مفاسد سے بچنے کے لیے جس خدا کا سہارا لے سکتے ہیں وہ صرف اسلام کا پیش کردہ خدا ہے، اور جس دین کو اختیار کر کے یہ ایک جہانی ریاست کے تصور کی طرف اقدام کر سکتے ہیں وہ اسلام ہی کا دین ہے۔

لیکن یہ اب اسلام تک کیسے پہنچیں؟ اسلام کے بارے میں ان کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ اسلام ان تک اگر پہنچا بھی ہے تو ایسے ذرائع سے پہنچا ہے اور ایسی شکل میں پہنچا ہے اور پھر اس شکل میں آکر بھی متعصب پادریوں اور مستشرقوں نے اس کے چہرے پر ایسے ایسے رنگ پھیر دیے ہیں کہ وہ اسکی حقیقت

ؔ عیسائیت کا از سرِ نو ایک زندہ مذہب بننا ممکن نہیں ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ اس کو پوری طرح تجربہ میں لا کر جدید انسان نے اس لیے ترک کیا ہے کہ اس میں زندگی کے وسیع تقاضوں کا جواب دینے کی صلاحیت نہیں ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ دورِ حاضر کا تمدن عیسائیت سے ٹکرا کر اور اسے پچھاڑ کر پروان چڑھا ہے۔ کسی مذہب سے آہستہ آہستہ تغافل پیدا ہو جانا اور چیز ہے، اور انسانیت کا اس کے خلاف لڑنے پر مجبور ہو جانا بالکل اور چیز ہے۔ جن مذاہب سے آدمی ٹکرا کر اور قربانیاں دے کر نجات پائی ہے ان کو وہ دوبارہ اجتماعی حیثیت سے اختیار نہیں کر سکتا، یہ الگ بات ہے کہ چند افراد ایسے مذاہب کے زیر اثر رہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بارے میں ایک فیصدی حد تک بھی صحیح واقفیت نہیں رکھتے۔ اسلام پر ان کے مفید مطلب لٹریچر اول تو موجود ہی نہیں ہے، اور اگر ہو بھی تو دنیا نے کسی دین اور کسی نظام زندگی کی تعلیم کتابوں سے کبھی حاصل نہیں کی ہے، بلکہ دین اور نظام زندگی کا درس ان کے علمبرداروں کی زندگیوں سے لیا جاتا ہے۔

اسلام کے علمبرداروں کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے دین کی بنیادوں پر ایک نظام زندگی استوار کر کے پوری دنیا کے سامنے اس کا مظاہرہ کرتے۔ لیکن انہوں نے اُلٹا خود اس دین کو تج کر مرعوبانہ اور مقلدانہ انداز سے مغربی تمدن کو اپنایا، اپنے دین سے انہوں نے عار محسوس کی، اپنے دین کا انہوں نے مذاق اڑایا، اپنے دین کو انہوں نے ایک تحریکی طاقت بننے سے روکا، اور آج تک وہ اس کے قابل عمل ہونے تک کے بارے میں بے یقین ہیں۔

مغربی اقوام کے سامنے اسلام کو ایک نظام زندگی ہونے کی حیثیت سے پیش کرنے کا موقع زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو رہا ہے، جیسا کہ اوپر کے اقتباسات سے ظاہر ہے۔ مگر اس دین کو آپ مغربی تمدن کے کارپردازوں کے سامنے ایک قابل عمل نظام زندگی ہونے کی حیثیت سے محض وقتاً فوقتاً چند مبلغ بھیج کر پیش نہیں کر سکتے۔ اس طریقے سے اسے آپ پیش کر کے زیادہ سے زیادہ نچلی سطح کے چند افراد پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، وہ بھی صرف اس حد تک کہ پہلے جو مقام عیسائیت کا تھا وہی اب ان کے لیے اسلام کو حاصل ہو جائے۔ یعنی ان طریقوں سے اسلام ایک انفرادی مذہب کے طور پر چند افراد کے لیے قابل قبول ہو جائے گا، لیکن یہ ممکن نہیں ہو گا کہ یہ ایک نظام زندگی کی حیثیت سے کسی مغربی ملک میں ایک انقلابی تحریک بن کے اٹھ کھڑا ہو۔

اس مقصد کے لیے واحد صورت ایک ہے۔ یہ کہ مسلمان قوموں میں سے کوئی بھی جسے اللہ اس کی توفیق دے دے، مغربی تمدن کی مرعوبیت کو ختم کر کے بہ حیثیت قوم اسلام کی علمبردار بن کے اٹھ کھڑی ہو۔ وہ اس نظام کو اپنی ریاست میں عملاً برپا کر دے اور اپنے پورے وجود کو اس کی طرف دعوت دینے کا ذریعہ بنا دے۔ جب تک اس طرح شہادت علی الناس کا فریضہ انجام دینے کے لیے خود مسلمان قوموں میں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی تیار نہ ہو، اہل مغرب خود بھی بھٹکتے رہیں گے اور ان کا تسلط یافتہ تمدن ساری دنیا کے لیے بھی موجب مصیبت بنا رہے گا ——— اور اس طرح عالم انسانی جس ضلالت میں مبتلا رہے گا اس کی ذمہ داری کا بوجھ اللہ کی عدالت میں بڑی حد تک وہ لوگ اپنے سروں پر اٹھائے ہوئے پیش ہونگے جو اسلام کو پیش کرنے کے ذمہ دار بنا کے اٹھائے گئے تھے مگر الٹا وہ دنیا بھر کو اس سے محروم رکھنے کا ذریعہ بن گئے۔

آج پاکستان میں اسی عظیم الشان کام کے لیے جدوجہد ہو رہی ہے کہ اسلام کا بحیثیت نظام زندگی ایک جامع مظاہرہ پوری دنیا کے سامنے کرنے کی صورت پیدا ہو جائے اور یہ قوم ساری قوموں کے لیے اور یہ ریاست ساری ریاستوں کے لیے فلاح و سعادت کی روشنی بہم پہنچانے کا وسیلہ بنے۔

اس جدوجہد میں ہمارے ملک کی جو اقلیت رکاوٹ ڈال رہی ہے، وہ مغربی تمدن سے مرعوب ہونے کا شرف رکھتی ہے۔ ہم مندرجۂ بالا اقتباسات کو ایسے لوگوں کے سامنے رکھ کر ان کو توجہ دلاتے ہیں کہ آنکھیں کھولیے، اب تو خود اس تمدن کے چلانے والے مفکرین اس کے عیوب کھول کھول کے پیش کرنے لگے ہیں ——— اور ٹھیک یہی عیوب ہیں کہ جن کو اختیار کرنے کا نام آپ کے ہاں "ترقی" ہے۔ پھر وہ جن تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں وہ ایسی ہیں کہ جن کے نام لینے والوں کو آپ کھٹ سے ملائیت کی گالی دے دیا کرتے ہیں۔ آپ جن پہلوؤں میں مغرب کی تقلید کرنے پر فخر فرمانے کے عادی ہیں، مغرب اب اپنی زندگی کے ان پہلوؤں سے خود نجات پانے کی فکر کر رہا ہے۔ وہی بات کہ — ؏

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

یقین جانیے کہ اب وہ وقت گذر گیا ہے جب کہ آپ اسلام سے تنفر کا اظہار کر کرکے، یا اس کو مغربی تمدن سے مطابقت دے دے کر اپنے آپ کو روشن خیال ثابت کر سکتے تھے اور تمدن حاضر کے کارپردازوں کی نگاہوں میں کھپ سکتے تھے۔ آج دنیا اتنی بدل چکی ہے کہ اگر آپ اب بھی تمدن مغرب کے مفاسد کو اٹھا اٹھا کے چومتے رہیں تو آپ کا مضحکہ اڑے گا، کیونکہ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ کسی ہوٹل کے پچھواڑے ڈالے جانے والے کوڑے کو کرید کرید کر آپ ڈبل روٹیوں کے ٹکڑے اٹھائیں اور پھر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کو سر راہ مزے سے لے لے کے نوش فرماتے ہوئے یہ تصور کریں کہ ہم ترقی پسند ہیں۔

آج آپ کے لیے دنیا کی پیشوائی کا ایک موقع پیدا ہو رہا ہے، اور ناموسِ فطرت یہی ہے کہ جب تاریخِ انسانی میں کسی ایک پیشوائی کی آزمائش مکمل ہو چکتی ہے اور وہ اپنی ناکامی کو پہنچ جاتی ہے تو پھر بالکل پیچھے کی صفوں سے کوئی قوم دنیا کی امامت کے لیے اٹھا کھڑی کی جاتی ہے جو دم توڑنے والے تمدن کے مقابلے میں ایک بہتر تہذیب و تمدن کے اصول انسانیت کو بہم پہنچا سکے۔ یہ ایک فیصلہ کن تاریخی لمحہ ہے، اور آج موقع ہے کہ آپ دنیا کو فساد سے بھر دینے والی تہذیب و تمدن کی اندھی تقلید سے آزاد ہو کر اسلامی نظریۂ زندگی کا علم بلند کر دیں۔ ایسے مواقع روز روز نہیں آیا کرتے، اور ان کو ہاتھ سے ایک مرتبہ دینے کے بعد مشکل ہی سے واپس حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ماہنامہ

چراغِ راہ (کراچی)

ادب میں اسلامی قدروں کا علمبردار

بہ ادارت

نعیم صدیقی

ملاحظہ فرمائیے:-

اشاعتِ خاص • جنوری ۱۹۵۳ء

جو

ادبی مضامین، منظومات، منثورات، طنز و مزاح، افسانہ و تمثیل کا ایک زندگی افروز مجموعہ ہے ـــ ایک مستقل باب "جائزہ پاکستان" کے عنوان سے خاص طور پر لکھوائے ہوئے مقالات پر مشتمل ہے۔

ضخامت ۳۳۶ صفحات ـــ قیمت سوا تین روپے

مینیجر "چراغِ راہ" ۹- لوٹیا بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ کراچی

© rasailojaraid.com